روش ندیم کا ترقی پسند شعور (ایک جائزہ)

سائرہ بانو

Saira Bano

Research Scholar, Department of Urdu,
National University of Modern Languages, Islamabad.

ڈاکٹر مشتاق احمد

Dr. Mushtaq Ahmad

Associate Professor, Department of Urdu,
University of Sialkot, Sialkot.

Abstract:

The progressive movement has been important in urdu literature.This movement has been started in 1936 in Nocking Restaurnt.This movement started with the effort of a few writers. And as soon as we saw it, it emerged as the most active and dynamic movement in urdu literature. There were well known writers and poets like Ali Srdar jafri, Sjjad zaheer, sarojni nydo, Faiz Ahmad Faiz, Mulk Raj Annad, through whose effort this movement continued to play its role.Now a days Ravish Nadeem is one of the most important writer of modern progressive consciousness whose writings are a reflection of his consciousness. Through his writings he seems to support the weak and underprivileged. The article under review is intended to explain their progressive consciousness.

کسی بھی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے اس وقت تک کامرانی سے ہم کنار نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے رسم و رواج، اقدار، روایات اور نظریات وافکار میں تبدیلی نہ لائیں۔ سماج میں رہتے ہوئے اور اپنی بقاء کے تحفظ کے لیے تبدیلی کا عمل ناگزیر ہے۔ تبدیلی ہی کے باعث قوموں نے ارتقائی منازل طے کیں۔ اقدار، رسم ورواج میں تبدیلی لا کر اور نئے تقاضوں کا ساتھ دے کر کامیابی کی امید کی جا سکتی ہے۔ دورِ حاضر میں حرکت و عمل ہی کامیابی کی دلیل ہے۔ حرکت ہی کسی

بھی گروہ، قبیلے، سماج، علاقے یا ملک کی ترقی میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ حرکت کے برعکس اگر جمود کا ذکر کیا جائے تو کائنات کے تمام رنگ پھیکے محسوس ہوتے ہیں۔ کائنات کی دلکشی اور رعنائی یک دم ماند پڑ جاتی ہے۔ اور اس جمود کی حمایت وہی لوگ کرتے ہیں جو اپنے پرکھوں کی روایات اور رسم و رواج سے کسی بھی طور انحراف کرنا اپنے لیے گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ کائنات میں وجود قائم رکھنے اور آگے بڑھنے کے لیے بزرگوں کی روایات اور رسم و رواج پر عمل پیرا ہونا لازم ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوا جا سکتا۔ ایسے تمام نظریات کے حامل افراد کو اگر رجعت پسند کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ ڈاکٹر سلیم اختر اس بابت کہتے ہیں:

> "جس طرح ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں اسی طرح ترقی پسندی / ترقی پسندانہ روش / ترقی پسندانہ رویہ / ترقی پسندانہ طرز احساس میں بھی تغیر کو ثبات ہے (یا ہونا چاہیے) ٹھہرنا، رکنا، جمود کے مترادف ہے۔ جب کہ جمود موت کا دوسرا نام ہے۔"(۱)

ایسے تمام طبقات جو آباء کے نظریات کو وقت کے مطابق ڈھال لیتے ہیں وہ ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں اور زمانہ کی رفتار کے ساتھ چلنا سیکھ جاتے ہیں۔ ایسے تمام افراد ترقی پسند افراد کی فہرست میں آتے ہیں جو اپنے اسلاف کی اقدار میں حالات کی مناسبت سے ترمیم کر کے اپنے لیے بہتری کی راہ تلاش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیل زمانہ انہیں آگے سے آگے ہی بہا کر لے جاتا ہے اور وہ ہمیشہ بلند مقام حاصل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر روش ندیم بھی ایسی ہی ترقی پسندی کے حامی ہیں جس کے ذریعے عوام الناس اپنی بہتری سے آگاہ ہو سکیں اور اپنے لیے بہتر مستقبل کے مواقع پیدا کر سکیں۔ اپنی شاعری، تحریروں، بیانات، تنقیدات اور انٹرویوز میں روش ندیم ہمیں ایسے ہی طبقے ہی حمایت کرتے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ روش ندیم کو جدید نظم کے حوالے سے جانا جاتا ہے مگر انہوں نے جدید نظم کے فروغ کے علاوہ اور بھی بہت سے موضوعات پر قلم اٹھایا۔ سیاست، سماجیت، معیشت اور معاشرت کے حوالے سے انہوں نے جو بھی لکھا ہمیں ان میں ترقی پسندی کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ اپنی ہر تحریر میں وہ موجودہ دور میں ہونے والے ظلم، بربریت، دہشت اور ناانصافی کا ذکر واشگاف الفاظ میں کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کم و بیش تمام تحریروں میں پرولتاریہ اور بورژوا طبقے کا ذکر کیا ہے۔ وہ ہمیشہ سے مظلوم مزدوروں کے لیے پریشان دکھائی دیتے ہیں اور اس بات سے رنجیدہ رہتے ہیں کہ مظلوم طبقہ اپنے حق کے لیے حاکم طبقے کے آگے آواز بلند کیوں نہیں کرتا؟ وہ کیوں حاکم طبقے کے ہاتھوں مجبور ہے؟ اور کیوں ظلم کی چکی میں مسلسل پس رہا ہے؟ روش ندیم اس کڑی حقیقت کا ذکر بھی کرتے ہیں معاشرے میں موجود این جی اوز اور افرادی قوتیں کس طرح غریب عوام کے حقوق غصب کرتی ہیں اور ان کو بہتر مستقبل کے سنہرے خواب دکھا کر تنہا چھوڑ دیتی ہیں۔ بین الاقوامی قوتیں بھی عوام کی بہتری کا دعوی کرتی ہیں مگر حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے انہوں نے ایسا عظیم نیٹ ورک قائم کیا

ہوتا ہے جس کی بدولت جہالت، بے روزگاری، غربت اور بے راہ روی جیسی برائیاں معاشرے میں جنم لیتی ہیں اور یہ کیسے ممکن ہے کہ ایسا طبقہ جہاں مزدوروں کا استحصال کرنا فرضِ اولیں سمجھا جاتا ہو وہاں یہ سب برائیاں پیدا نہ ہوں اور اس معاشرے میں اضطراب اور بے چینی کی فضا قائم نہ ہوتی ہو۔ بقول روش ندیم:

> ''عوام کے منتخب نمائندے جب ریاستی اداروں میں پہنچتے ہیں تو عوامی امنگوں کے برعکس بالادست طبقات کی سیاسی ترجیحات کی حامل ریاستی ترجیحات کے تابع ہو جاتے ہیں یوں وہ بلواسطہ بالادست طبقات ہی کی نمائندے بن کے رہ جاتے ہیں۔''(۲)

روس کی عوام نے متحدہ ہو کر اپنے حق کے لیے آواز اٹھائی۔ مزدوروں غریبوں نے حاکم طبقے کے خلاف بغاوت کا آغاز کیا۔ اپنے جائز حق کے لیے بولنا شروع کیا، وہیں سے صحیح معنوں میں ترقی پسندی کا آغاز ہوا۔ انقلاب روس نے تیسری دنیا کے ممالک کو بیدار کرنے کے لیے رہنمائی کا فریضہ سر انجام دیا۔ تیسری دنیا کے ممالک بھی اگر متحد ہو کر اپنے حق کے لیے آواز بلند کرتے تو وہ بہت سے مسائل کا حل تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے مگر وہ ایسا نہیں کرتے، بلکہ تیسری دنیا کے عوام اپنے حکام کے اشاروں پر ناچتے ہیں اور ان کے سامنے بے بس ہوتے ہیں ان ممالک میں بظاہر تو جمہوریت کا نفاذ نظر آتا ہے مگر حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ صورتحال یہ ہوتی ہے کہ عوام کو دھوکے میں رکھ کر جمہوریت تو نافذ کر دی جاتی ہے مگر اس کی روح اس میں موجود نہیں ہوتی۔ بقول روش ندیم:

> ''ہمارے ہاں جمہوریت کی ناکامی کی بڑی وجہ یہاں کا مرکزیت پس نو آبادیاتی ڈھانچہ ہے جس میں سماجی ، سیاسی اور معاشی حوالوں سے تمام اختیارات اعلیٰ سیاسی شخصیات، ریاستی اداروں اور ریاستی مشینری تر تک محدود ہو گئے ہیں۔''(۳)

روش ندیم اس بات پر زور دیتے ہی کہ کسی بھی صورت عوام کو نظر انداز کر کے کامیابی یقینی نہیں بنائی جا سکتی سیاسی، سماجی اختیارات عوام کو منتقل کر کے ہی کامیابی کے حصول کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ عوام کے برعکس اگر کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کے جائز اور ناجائز حکم چلتے رہے تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ سیاست، ملک اور معیشت میں بہتری آسکے۔ بہتری کے لیے سماج اور فردِ واحد کی ترقی لازم ہے اور سماج ایسا جس میں ہر کسی کو برابر اور یکساں حقوق حاصل ہوں۔ اپنے ترقی پسند شعور کو واضح کرنے کے لیے روش ندیم کا کہنا ہے کہ دنیا بھر سے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا عوام کے سامنے یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ سماج میں سب لوگوں کو ترقی کے مواقع ملتے ہیں مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ کوئی بھی معاشرہ حاکم اور محکوم کے وجود کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حاکم طبقہ محکوم طبقے کیلیے ذاتی پسند اور ناپسند کے معیار سماج میں رہتے ہوئے مقرر کرتا ہے ان سے مزدور طبقے میں بہت سے ذاتی مسائل جنم لیتے ہیں مگر مزدور طبقہ بالادست طبقے کی رضا میں راضی ہو جاتا ہے کیونکہ ان کا یہ خیال ہوتا ہے کہ حاکم طبقہ ان کے مسائل کے حل کے لیے تدابیر کرتا رہتا ہے تعلیم اور سہولیات کی کمی کے

سبب محکوم طبقہ اخلاقیات کو پس پشت ڈال کر ایک دوسرے کے خلاف جنگ و جدل پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جدید علوم و فنون کی کمی ان کی ترقی کی راہ میں آڑے آتی ہے۔ ایسے میں روش ندیم کا کہنا ہے کہ جدید علوم بھی مراعات یافتہ طبقے کے لیے ہی مفید ثابت ہوتے ہیں محکوم طبقہ ان سے استفادہ نہیں کر پاتا۔ بالکل اسی طرح فن اور ادب کے میدان میں رونما ہونے والی جدید تبدیلیاں بھی مراعات یافتہ طبقے کے لیے عمل میں لائی جاتی ہیں جن سے محکوم اور مزدور طبقے کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ معاشرے میں جیسے جیسے طبقاتی شعور پروان چڑھے گا ویسے ہی معاشرتی آزادی کی سمجھ بوجھ بھی منظر عام پر آئے گی۔ لیکن اگر معاشرے کو مقدس گردان کر حاکم طبقے کو خوش رکھنے کا خیال ذہن میں ہو تو محروم طبقہ کبھی کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے کامیابی کے حصول کے لیے طبقات کے دائرے سے باہر نکلنا ہو گا۔ روش ندیم اس بارے میں کہتے ہیں:

> ''پس کسی بھی ریاست سے مراد ایک ایسا معاشرہ جس میں دو واضح طبقات موجود ہوں جہاں ریاستی جبر کے ذریعے ایک وسیع عوامی طبقے کی سیاسی اور معاشرتی آزادیوں کو پیچیدہ مشروط اور محدود تر کر دیا جاتا ہے۔ جب کہ دوسرا حکمران بالادست طبقہ اپنے ریاستی مفادات کے حصول کے لیے اول الزکر، بے بس محروم طبقہ کے استحصال کو جاری رکھتا ہے۔'' (۴)

تاریخ میں جب کہیں مزدوروں نے انقلاب برپا کیا انہوں نے پرانے سیاسی نظام کو توڑ دیا۔ وہ اس کے بعد اس قابل ہوئے کہ انقلاب کو منظر عام پر لا سکیں، کیونکہ ریاستی اور قانونی اداروں کی دہشت کو ختم کر کے ہی سیاسی نظام میں ارتقاء کا عمل لایا جاتا ہے۔ روش ندیم کے نکتہ نظر کے مطابق جس طرح موجودہ دور میں سرمایہ دار بین الاقوامی طاقتوں نے محکوم ممالک کو اپنے زیر اثر کر رکھا ہے اور وہاں سے ہر طرح کے مفاد حاصل کر رہے ہیں ایسے ہی دوسری جنگ عظیم سے قبل بھی سرمایہ دار طاقتیں اسی انداز کو اپناتے ہوئے اپنے مفادات حاصل کرتی رہی ہیں اس لئے ان کو آپس میں رابطہ رکھنا پڑتا تھا تاکہ ان کے تعلقات پروان چڑھتے رہیں اور وہ بہتر انداز میں محکوم ممالک کو لوٹ سکیں۔ روش ندیم کے نزدیک:

> ''ان سرمایہ دارانہ جنگوں اور قبضوں کا آغاز ۱۶ویں صدی میں ہی ہو گیا تھا۔'' (۵)

روش ندیم کے نزدیک عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے ماہرین نے یہ محسوس کیا ہے کہ پچھلے بیس سالوں سے ان مسائل میں اضافہ ہوا ہے تیسری دنیا کے ممالک ان مسائل سے نبرد آزما ہیں مگر اس دلدل سے باہر نہیں نکل پا رہے جس کی بدولت اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے ایسے میں جدید سوچ رکھنے والے چند ماہرین نے ایسے طریقے رائج کئے ہیں جو اینٹی سٹیٹ کی بنیاد پر اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ یہ ادارے عام زبان میں NGO,S کہلاتے ہیں جو فری مارکیٹ اکانومی سے (آزادانہ طور پر) اپنا کاروبار دنیا کے کسی بھی حصے میں شروع کر سکتے ہیں اس سلسلے میں جو NGO,S اپنا کردار ادا کر رہی ہیں وہ حکومت کی سرپرستی سے آزاد ہیں اور اپنا کام فعال طور پر سرانجام دے رہی ہیں۔ یہ ایسے ادارے ہیں جو ترقی

پسند، سماج دوست بننے کا دعوٰی کرتے ہوئے پسماندہ طبقات کی نظریاتی تحریکوں کو ہائی جیک کر رہے ہیں بقول روش ندیم:

"گو ریاست عوام کی خدمت گزاری کے لیے وجود میں نہیں آئی بلکہ معاشرے کے استحصالی اعلٰی طبقات کی حفاظت اور استحکام کے لئے تشکیل پزیر ہوئی ہے۔"(۶)

ایسے میں NGO,S کی پہلی ترجیح ریاست کے کردار کو ختم کر دینا ہی ہوتی ہے ایسی ہی NGO,S کو دائیں بازو کی قوتیں اسلام دشمن اور ملک دشمن قرار دیتی ہیں جبکہ بائیں بازو کی قوتیں ان کو ترقی پسند فلاحی کارناموں کا نام دے کر ان کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ روش ندیم کا کہنا ہے:

"ضرورت اس امر کی ہے کہ لوگوں کو استحصالی نظام کے میکانزم کا شعور دے کر انہیں آئیڈیالوجی کے تحت منظم کیا جائے۔"(۷)

پاکستان واحد ملک ہے جس میں جمہوریت کا تجربہ نو آبادیات کے خاتمے کے بغیر کیا جاتا رہا ہے۔ ہمارے ہاں کی سیاسی پارٹیاں عوام میں شعور کو بیدار کرنے میں ناکام رہی ہیں کیونکہ یہ پارٹیاں اپنے مفاد کے لئے کام کرتی رہتی ہیں اور عوام کے مفاد کو پس پشت ڈالتی رہتی ہیں یہ پارٹیاں اپنے داخلی اور خارجی نظام میں غیر جمہوری طرزِ عمل کا مظاہرہ بھی کرتی نظر آتی ہیں۔ ہر دور میں پاکستان میں دو طبقے رہے ہیں ان دونوں طبقات کے مفاد تقسیم سے قبل انگریزوں سے وابستہ تھے ۔ متوسط طبقے میں مزدور، کسان، طالب علم، دکاندار اور ملازم پیشہ لوگ تھے جب کی جاگیر دار طبقے میں علی گڑھ سے فیض حاصل کرنے والے افراد تھے جو انگریزوں سے مفاہمت کو ہی بہتر سمجھتے تھے چونکہ وہ پڑھے لکھے تھے اس لئے انگریزوں سے مفاہمت کی بنا پر وہ اعلٰی عہدے حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ انگریزوں نے جو جاگیر داری نظام رائج کیا اس کی بدولت وہ خود کو رعایا کی زندگی کا مالک سمجھتے تھے۔ قیام پاکستان کے وقت چونکہ خواندہ طبقہ قلیل تعداد میں تھا لہٰذا اس کو ڈاک، محکمہ مال اور پولیس جیسے شعبوں میں بھرتی کیا گیا ایسے میں انگریزوں نے اپنی بقاء کے لئے ایسی پست درجہ تعلیم کا آغاز کیا جس کو حاصل کر کے عوام میں شعور نام کی کوئی چیز پیدا نہ ہو۔ بقول چارلس ٹریلن:

"ہندوستانی نوجوان جب ہم سے واقفیت پیدا کرتے ہیں تو پھر وہ ہمیں غیر نہیں سمجھتے۔ ہمارے بڑے بڑے لوگوں کو اچھے الفاظ اور احترام سے یاد کرتے ہیں ان کے بارے میں وہ بھی ہماری طرح سوچتے ہیں۔ یہ ہندوستانی نوجوان ہماری تہذیب و ثقافت کے رنگ میں رنگے جا چکے ہیں جیسا ہم سوچتے ہیں جیسے ہم پسند کرتے ہیں ایسے ہی وہ بھی پسند کرتے ہیں۔ وہ ہندوستانی سے زیادہ برطانوی ہیں۔"(۸)

روش ندیم کے نزدیک یہ درمیانہ طبقہ تھا جس میں روس جیسے طبقے کی طرح جوش موجود نہ تھا کیونکہ یہ وہ طبقہ تھا جسے انگریزوں نے اپنی منشاء کے مطابق تیار کیا تھا۔ کیونکہ جاگیر داروں اور صنعت کاروں کی بدولت درمیانہ طبقہ حکومت

کے کام کا تھا جو بغیر کسی پس و پیش کے کام کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان کے چھ سال بعد جب امریکہ کی امداد کا استعمال شروع ہوا تو امریکہ آہستہ آہستہ تیسری دنیا کی عوام پر قابض ہوتا گیا اور یہی امریکی اثر اس وقت زیادہ ہوا جب اقتدار جنرل ایوب نے سنبھالا۔ روش ندیم کا کہنا ہے:

> ''موجودہ نوجوان ادیب نسل نے سوشیو پولیٹیکل کے حوالے سے بڑا ہنگامہ خیز دور دیکھا ہے اس نسل نے شعور کی آنکھ جنرل ضیاء الحق کے دور میں۔۔۔یہود و ہنود کی دشمنی سے ان کی دوستی تک، بلیک اینڈ وائٹ پی ٹی وی سے گلوبل میڈیا تک کے حیرت انگیز تغیرات سب اس دور میں ہوئے۔''(۹)

ترقی پسند شعور کی وضاحت کرتے ہوئے روش ندیم کا کہنا ہے کہ انسان کی اپنی آزادی کے لئے کی جانے والی کوشش ہی درحقیقت تاریخ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ آزادی کی جدوجہد ہی اصل میں وحشت اور بربریت کے خلاف جنگ کا آغاز ہے۔ پہلے پہلڈ ظغ جب انسان نے تہذیب کا آغاز کیا تو اس سے بہت پہلے ہی جائیدادوں اور ملکیتوں کا تصور فروغ پا چکا تھا۔ ایسے خاندان جن کے پاس کثیر تعداد میں جائیدادیں اور جاگیریں تھیں وہ مقدس گردانے جاتے تھیاور قابل احترام تسلیم کیے جاتے تھے انہوں نے زورِ بازو سے اپنے سے کم تر اور کم حیثیت کو اپنا غلام بنالیا اور ان کی جائیدادوں پر قابض ہوتے گئے ایسے ہی بادشاہت وجود میں آئی اور بادشاہ کو ظلِ الٰہی سمجھا جانے لگا۔ اس کے منہ سے نکلا ہر لفظ مقدس گردانا گیا۔ بادشاہ کی رضا کے لیے لوگوں کا قتلِ عام کیا جاتا تھا اور عام رعایا کو اتنی اجازت تک نہ تھی کہ وہ بادشاہ کو نظر بھر کر دیکھ سکیں۔ اس زمانے کی سیاست آہستہ آہستہ پروان چڑھتی گئی اور بادشاہ کو عروجِ عام حاصل ہوتا گیا۔ جیسے ہی لوگوں میں شعور پروان چڑھا لوگوں کے اختیار میں کمی آتی گئی۔ بقول روش ندیم:

> ''تاریخ میں بادشاہت کی صورت میں فردِ واحد کی کلیتا حکمرانی کے خلاف اہم موڑ اس وقت آیا جب مغرب میں تین سو سالہ احیائے علوم کی تحریک اور نشاطِ ثانیہ کے بعد منفی انقلاب کے نتیجے میں ایک جمہوری آئین کے تحت جمہوریت کا آغاز ہوا۔''(۱۰)

روش ندیم کا کہنا ہے کہ مغلیہ دور کے آغاز میں یورپ میں جاگیر دارانہ نظام رائج ہو چکا تھا۔ ۲ فیصد لوگ امیر اور ۹۸ فیصد لوگ غربت سے بھی نچلے درجے میں زندگی گزار رہے تھے جن سے امراء محنت مشقت لیتے اور اس کے عوض ان کو بمشکل دو وقت کا کھانا میسر کیا جاتا تھا۔ مذہبی واعظ، بادشاہ اور جاگیر دار تینوں ہی مل کر عوام کو لوٹنے کے درپے تھے۔ شہر تب چھوٹے تھے آمدنی محدود تھی لہٰذا زائد سرمائے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گیارہویں صدی میں اٹلی نے تجارت کا آغاز کیا تو اس کے کچھ عرصے بعد فرانس اور سپین بھی اسی ڈگر پر چل پڑے تب ہی تاجروں نے جاگیرداروں سے اپنے حقوق کا مطالبہ کیا۔ انگریزوں کے دور میں بھی ایسا طبقہ وارد ہوا جس نے ہول سیل کا کاروبار متعارف کرایا۔ اس طرح کاریگر اور تاجر کی الگ

الگ حیثیت مقرر ہو گئی۔ کچھ عرصے بعد کاریگروں نے زائد آمدنی کا استعمال کر کے تجارت میں خاص مقام حاصل کر لیا اور تاجر کو اس میں مزدور کی حیثیت دی گئی۔ اس عمل کی بدولت کاریگر امیر اور تاجر محنت فروش بنتے گئے۔

روش ندیم کے نزدیک کسی ریاست کی عمرانی سطح پر تقسیم اس ضروری ہو جاتی ہے کہ پتہ لگایا جا سکے کہ معاشرہ مختلف طبقوں میں منقسم کیوں ہوا؟ امیر کیسے امیر تر ہو گیا اور غریب کیونکر غربت کی چکی میں پستا رہا۔ تیسری دنیا کی آزادی کے بعد جاگیر دارانہ نظام کا خاتمہ نہ ہو سکا۔ کیونکہ حاکم اور محکوم دونوں اپنے کام عمدگی سے سر انجام دے رہے تھے ایسے میں محکوم محنت کرنے والا اور حاکم لوٹ کھسوٹ کرنے والے بن گئے۔ تیسری دنیا میں جاگیر داری نظام کی بدولت مزدور طبقہ آزادانہ طور پر محنت کے قابل نہ رہا۔ پیداوار کو وسعت دینے کے لیے زرعی صنعتی آلات کو یقینی بنایا گیا مگر اس سے جاگیر داری نظام کا خاتمہ نہ ہو سکا اور تعلیم و صحت کے معاملات میں مسائل ہی پیدا ہوتے گئے۔ تیسری دنیا میں زرعی زمین کی تقسیم کے باعث چھوٹے زمیندار بھی منظر عام پر آ گئے جو جاگیر داروں سے کم تر سطح کے تھے لیکن مزدور طبقے سے بلند تر ہوتے گئے۔ ایسے میں وہ معاشرہ دو طبقوں میں منقسم تھا بعد میں تین میں تقسیم ہو گیا۔ جن میں سرمایہ دار مزدور اور چھوٹے زمیندار بھی شامل ہو گئے۔ جن علاقوں میں جاگیر داری نظام ختم ہوا وہاں چھوٹے زمینداروں نے جاگیر دارانہ اطوار اپنائے اور بے زمین کسانوں کا استحصال جاری رکھا:

> "تیسری دنیا کے چھوٹے بڑے صنعتی اور نیم صنعتی شہروں میں عموماً تین قسم کے طبقات پائے جاتے ہیں۔ اول تنخواہ دار دیہاڑی دار عام محنت کش، دوم محدود سطح پر مصنوعات تیار کر کے منافع کمانے والا نچلا طبقہ اور سوم ملکی سطح پر بڑے کارخانوں، ملوں اور فیکٹریوں کے مالکان۔"(۱۱)

ترقی پسند شعور کی بابت روش ندیم کا خیال ہے کہ یومیہ اجرت حاصل کرنے والے مزدور اور ملکی صنعتی کار کا آپس میں رابطہ نہیں ہو پاتا۔ صنعت کار اپنا مال دوسرے شہروں میں اور بعض اوقات دوسرے ممالک میں پہنچانے کے لیے مصروف عمل رہتا ہے اس لیے وہ حکومت سے قرضے لیتا ہے اور ٹیکس معاف کراتا ہے۔ NGO,S سے رابطہ کرتا ہے جس کے باعث اس کا مزدور سے رابطہ نہیں ہوتا۔ اگر شہروں کے مزدور طبقے کی بات کریں تو وہ بھی جاگیر دار ہوں یا چھوٹے صنعت کار دونوں ہی بری طرح استحصال کا شکار ہوتے ہیں کیونکہ دونوں ہی اس کو اس کی محنت کا صلہ کم دیتے ہیں۔

روش ندیم کے ترقی پسند سیاسی، سماجی شعور کے مطابق ابتدا میں کاشتکاری کا آغاز ہونے کے ساتھ ساتھ قبائل کو فروغ ملا جن کو تاریخ کے ابتدائی غلام کا نام دیا گیا، ان سے کاشتکاری میں کام لیا جاتا تھا ان سے جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا تھا۔ اس دور میں قبائل میں جو لڑائیاں ہوتی تھیں ان کے اہم سبب زرخیز زمین، پالتو جانور، عورتیں اور غلاموں کا حصول ہوتا تھا۔ طاقت ور طبقات قبائلی علاقوں کی زمینوں اور پالتو جانوروں کو اپنے استعمال میں لاتے تھے جن

کے عوض ان کو چند روپے دیے جاتے تھے کہ وہ اپنی ضروریات زندگی پورا کرنے کے قابل ہو سکیں۔ ایسے ہی حاکم اور محکوم کا تصور معاشرے میں ابھرا۔ بقول روش ندیم:

"جب صنعتی سرمایہ داری دور میں کسان مزدوروں کی صورت اختیار کر گئے تو صنعتی پیداوار میں محنت کش کو حصہ دار بنانا سرمایہ دار کے مفادات کے خلاف تھا۔"(۱۲)

روش ندیم کا خیال ہے کہ عوام کا استحصال ہر حال میں جاری رہتا ہے اسی استحصال کو روش ندیم ترقی پسندی کی اصطلاح میں غلامی سے منسوب کرتے ہیں۔ روش ندیم کے نزدیک غلامی سے مراد عوام کی صلاحیتوں اور ہنر مندیوں کا مسلسل استعمال کرنا اور اس کے عوض ان کو جائز اور مناسب معاوضہ نہ دینا۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم بڑے عجیب دور سے گزر رہے ہیں جس میں انسانی رشتوں، جزبات اور احساسات کی کوئی قدر نہیں کی جاتی اور یہ سب کسی دوسری دنیا کی باتیں لگتی ہیں۔ موجودہ دور میں ہر طرف لالچ، ہوس، زر پرستی، موقع پرستی اور مفاد پرستی ہی دیکھنے میں ملتی ہے۔ اِس ہوسِ زر کے خاتمے کے بغیر معاشرے میں وجود قائم رکھنا ناممکن سی بات لگتی ہے۔ روش ندیم کے نزدیک موجودہ دور سرمایہ داری کی بدولت زمین ایک عالمی منڈی کی صورت اختیار کر چکی ہے جس میں خرید و فروخت کا نظام ہی کار فرما نظر آتا ہے، انسانی جزبات سے لے کر مٹی، ہوا تک ہر چیز بیچی اور خریدی جا رہی ہے یہ سب ہوسِ زر کا ہی نتیجہ ہے۔ بقول روش ندیم:

"یہ معلوم کائنات میں پہلی دفعہ ہوا کہ زندہ مخلوق کا کوئی سیارہ محض تھوک پرچون کی دکان بن کر رہ گیا ہے جس پر عالمی تجارتی کمپنیوں کا قبضہ ہے۔"(۱۳)

ترقی پسندی کی وضاحت کرتے ہوئے ان کا کہنا ہے کہ نظامِ زر کی بدولت سیاست، سماج، معیشت، اخلاق، مذہب اور علم واب کو حقیقی انسانی جزبات سے عاری کر کے اسے بیوپاری نظام کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ جب تک اس بیوپاری اور زر یافتہ نظام کا خاتمہ نہیں ہو گا اس وقت تک ملکی معیشت کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتی۔ کسی بھی ریاست کے با اثر ادارے اپنے زیر اثر طبقات خواہ وہ حاکم ہوں یا محکوم، ان کے معاشی مفادات کا تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ روش ندیم کے سیاسی سماجی ترقی پسند شعور کے مطابق در حقیقت یہ ادارے بالا دست حکمران کی معیشت کو نکھارنے کے لیے ہی منظر عام پر آتے ہیں۔ معاشی نظام میں تبدیلی آنے سے پیداوار کا نظام بدلتا ہے مگر اس سے کمزور اور زیر دست طبقے کی بہتری نظر نہیں آتی۔ روش ندیم کے مطابق زراعت سے مزارعے کی اجرت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ دن رات کی محنت کے بعد پیداوار کا بڑا حصہ ٹیکس کی صورت میں ان سے لے لیا جاتا ہے جاگیر دار جب تک انتظامیہ کے ساتھ مفاہمت رکھتا ہے اس کے لیے مسائل پیدا نہیں مگر جیسے ہی مفاہمت ختم ہوتی ہے پیداوار میں ارتقاء کا عمل نافذ کر دیا جاتا ہے مجبوراً جاگیر داروں کو ان کے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے کیونکہ سرمائے کی مانگ جاگیر دار کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ روش ندیم کا کہنا ہے کہ بالا دست طبقے نے محصولات کا نظام متعارف کرایا تو اس طبقے کی حیثیت بڑھ گئی مگر مزدور طبقہ یہاں بھی پسپا رہا۔ ہر دور میں اس کو

مختلف نام دے کر رسوا کیا جاتا رہا۔ اس حوالے سے روش ندیم کا کہنا ہے کہ:

"ظاہراً نظر آنے والی ترقی ان کے لیے بے معنی رہی کیونکہ ان کا استحصال جاگیر داری کسان، منفی کسان اور مزدور تینوں صورتوں میں جاری رہا۔"(۱۴)

مختلف طبقات اور ان کا باہمی تعلق ہی وہ تعلق ہے جو حالاتِ زندگی سے پیدا ہوتا، بنتا اور بگڑتا رہتا ہے۔ عقائد، نظریات اور فلسفیانہ تصورات انسانی ذہن کے مادی حالاتِ زندگی اور اجتماعی و سماجی زندگی کا عکس ہوتے ہیں جن کی مدد سے انسان اپنی معاشرت کو سمجھتے ہیں، اس کا علم حاصل کرتے ہیں ار اسے برداشت کر کے حسین اور بدصورت بناتے ہیں۔ معاشرے کے خیالات، نظریات اور عقائد اسی سماج کے مطابق ہوں گے۔ جیسا طرز معاشرت ہو گا ویسا ہی تخیل ہو گا۔ قدیم قبائلی دور کے عقائد، رسم ورواج جاگیر داری دور کے نظریوں سے منفرد تھے۔ ایسے ہی سرمایہ دارانہ طرز فکر قدیم طرز معاشرت سے جدا تھا۔ سماج میں تبدیلی آلاتِ پیداوار اور وسائل کی بدولت آتی ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سماج میں نئے پیداوار کے انداز رائج ہو جانے سے قدیم آلاتِ پیداوار کی اہمیت کم ہو جاتی ہے ایسی صورت میں قدیم اور جدید کے مابین تصادم قائم ہو جاتا ہے۔ سجاد ظہیر اس بارے میں لکھتے ہیں:

"پرانے سماج کے تصورات اور عقائد ان طبقوں کی نمائندگی کرتے ہیں جو ان پرانے سماجی رشتوں کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں جن کے قائم رہنے سے نئی مادی ترقی رکتی ہے۔ اس لیے ایسے خیالات اور نظریے رجعت پسند کہے جاسکتے ہیں۔"(۱۵)

روش ندیم اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے جمہوریت کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان سب مسائل کے حل کے لیے عوام کا متحد ہونا لازم ہے۔ یعنی لوگوں کی ایسی جماعت جس کو لوگ اپنے کاموں کے لیے منتخب کریں جمہوریت کے زمرے میں آتی ہے جس میں حاکم طبقے کو محکوم طبقے کے افراد ووٹوں کے ذریعے منتخب کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ابراہیم لنکن کا حوالہ دیتے ہیں:

"Democracy is the government of the people , by the people for the people."(16)

روش ندیم اس حوالے سے اپنے سیاسی سماجی ترقی پسند شعور کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ملٹی نیشنل استحصالی طاقتیں تیسری دنیا کے لیے جمہوریت کو واحد حل تصور کرتی ہیں جس کے باعث یورپ اور امریکہ کامیابی حاصل کر سکے ہیں اِس لیے ان کا کہنا ہے کہ طاقتوں سے چھٹکارہ پانے کا واحد حل جمہوریت کو مانا جاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص: ۴۴۸

۲۔ روش ندیم، ڈاکٹر، تیسری دنیا کا فلسفہ انکار، لاہور: تخلیقات، ۲۰۰۱ء، ص:۳۵
۳۔ روش ندیم، ڈاکٹر، مضمون: جمہوریت اور مرکزیت، مشمولہ: اوصاف، روزنامہ، اسلام آباد، ۱۶ اگست ۱۹۹۹ء
۴۔ روش ندیم، ڈاکٹر، تیسری دنیا کا فلسفہ انکار، ص:۲۹
۵۔ روش ندیم، ڈاکٹر، مضمون: سرمایہ دارانہ ممالک کی عالمی بندر بانٹ، مشمولہ: اوصاف، روزنامہ، اسلام آباد، ۱۰ فروری ۲۰۰۰ء
۶۔ روش ندیم، ڈاکٹر، مضمون: این جی اوز ملک دشمن یا عوام دشمن، مشمولہ: اوصاف، روزنامہ، اسلام آباد، ۲۰ مئی ۱۹۹۹ء
۷۔ ایضاً
۸۔ روش ندیم، ڈاکٹر، پاکستان برطانوی غلامی سے امریکی غلامی تک، لاہور: تخلیقات، ۱۹۹۳ء، ص: ۸۴
۹۔ روش ندیم، ڈاکٹر، مضمون: نئے فکری وفنی رجحان کو ابھارنا ناممکن ہے، مشمولہ: اذکار، روزنامہ، اسلام آباد، ۲۳ ستمبر ۲۰۰۵ء
۱۰۔ روش ندیم، ڈاکٹر، مضمون: فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے زندگی یا موت، مشمولہ: اوصاف، روزنامہ، اسلام آباد، ۸ جولائی ۲۰۰۲ء
۱۱۔ روش ندیم، ڈاکٹر، تیسری دنیا کا فلسفہ انکار، ص: ۷۳
۱۲۔ روش ندیم، ڈاکٹر، مضمون: آزاد ملکوں کے غلام عوام، مشمولہ: اوصاف، روزنامہ، اسلام آباد، ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۹ء
۱۳۔ روش ندیم، ڈاکٹر، مضمون: عالمی تجارتی نظام کے متاثرین، مشمولہ: اوصاف، روزنامہ، اسلام آباد ۲۲ ستمبر ۱۹۹۹ء
۱۴۔ روش ندیم، ڈاکٹر، تیسری دنیا کا فلسفہ انکار، ص: ۳۹
۱۵۔ سجاد ظہیر، روشنائی، لاہور: کتاب نما، ۲۰۱۴ء، ص:۶
۱۶۔ روش ندیم، ڈاکٹر، تیسری دنیا کا فلسفہ انکار، ص:۳۷